رسائل و مسائل

برکت بانٹنے کا فتنہ

سوال :- احادیث کا ترجمہ چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں "آسان حدیث یا انمول موتی" کے نام سے بھوپال سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسط میں فضیلت نبی کے عنوان سے یہ روایت درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہو جاتے تھے تو مدینہ والوں کے خدمت گار اور غلام برتنوں میں پانی لے کر آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ ایک ایک برتن کے پانی میں ڈالتے، حتیٰ کہ شدید سردی میں بھی انکار نہ کرتے۔ اس کی تشریح میں یہ لکھا گیا ہے کہ بزرگ ہستیوں سے اس طریقہ سے برکت حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس معاملہ میں نبی اور ایک امتی بزرگ میں کوئی فرق نہیں ہے؟

جواب :- اس مضمون کی حدیث مسلم شریف وغیرہ میں موجود ہے، اس وجہ سے فی نفسہٖ واقعہ سے تو انکار نہیں ہو سکتا البتہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے۔ اس کے بعض پہلو قابل غور ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی اور ایک امتی میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ یعنی نبی معصوم ہوتا ہے اور اس کا صاحب فیض و برکت ہونا قطعی ہے پھر اس کا مقرب خدا ہونا خود اس کو بھی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے اہل ایمان بھی اس کی اس حیثیت کو جانتے ہیں۔ لیکن کسی امتی کو یہ باتیں اولاً تو اس درجہ تک حاصل نہیں ہوتیں اور اگر کسی حد تک اس کو خدا کا تقرب حاصل بھی ہوتا ہے اور اس کے اثر سے وہ صاحب برکت بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے مقرب خدا اور صاحب برکت ہونے کا صرف گمان کر سکتے ہیں، رہا یہ کہ فی الواقع وہ ایسا ہے یا نہیں، اس کی بابت نہ تو ہم کوئی قطعی علم رکھتے ہیں اور نہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کے ہاں اس کا درجہ کیا ہے اور اس کے اعمال مقبول ہیں یا مردود! چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کسی کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف میں یہ کہا گیا کہ فلاں ایسا اور ایسا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اس کو ایسا اور ایسا پایا ہے۔ اس وجہ سے ہر عالم یا شیخ یا پیر کو ایک بت بنا لینا، جیسا کہ اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں، کوئی صحیح اور معقول صورت نہیں معلوم ہوتی۔

اور اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو تو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ عوام اگر حصول برکت کے لیے علماء و مشائخ کے پاس ہجوم کرتے ہیں تو اس کو ان کی سادگی اور جہالت پر محمول کیا جا سکتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کی سادگی اور جہالت ہی ان کے لیے اللہ کے یہاں بھی عذر بن سکے، لیکن جو حضرات کہ بے تکلف اپنے آپ کو مقرب خدا اور منبع خیر و برکت مان کر برکت تقسیم کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بے دریغ اس جگہ بیٹھ جاتے ہیں جو صرف نبی اور کسی مبشر بالجنہ ہی کے لیے موزوں ہو سکتی ہے وہ تو اپنے ایمان کو سخت فتنہ میں ڈال دیتے ہیں اور اس طرح کے اشخاص سے ہمیں بدگمان کر دینے کے لیے ان کی یہ جسارت کافی ہے کہ وہ خود اپنے صاحب برکت ہونے کا عملی دعویٰ رکھتے ہیں۔ آج ہر مدرسہ اور خانقاہ میں برکت حاصل کرنے اور برکت تقسیم کرنے کا بازار گرم ہے اور برکت تقسیم کرنے والے حضرات اس

طرح کی احادیث کو اپنے لیے دلیل ٹھیراتے ہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے خدمتگاروں اور غلاموں کو برکت بخشتے تھے تو آخر یہی حق انھیں اپنے مریدوں اور عقیدت کیشوں کے لیے کیوں نہ حاصل ہو؟ ہمارے نزدیک تو اس طرح کے لوگ سخت فتنہ اور کبر نفس میں مبتلا ہیں۔ اور کسی محتاط اور خداترس آدمی کے لیے ہم یہ بات جائز نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ایمان کو اس طرح کی آزمائش میں ڈالے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات کا جہاں تک ہمیں علم ہے، باوجود تمام خصائص تقدس کے حامل ہونے کے "درشن دینے اور "برکت بانٹنے" سے سخت احتراز کرتے تھے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس طرز عمل سے آج ہمارے مشائخ سند پکڑتے ہیں اس کو اُن حضرات نے برأی العین مشاہدہ کیا تھا، اور قرآن ان کی نیکی اور تقوی پر گواہ تھا۔

"اجماع" اور "سواد اعظم" کی غلط تعبیریں

سوال:۔ ایک صاحب یہ حدیث بیان کرکے کہ "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" فرماتے ہیں کہ اجماع امت غلط بات پر نہیں ہوسکتا۔ پس جب علمائے ہند کی اکثریت جمعیۃ العلماء میں جذب ہوکر یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ اس وقت کانگریس کے ساتھ ہی اشتراک عمل عین اسلام کے مطابق ہے تو یہ بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ یہ صاحب اجماع امت سے مراد علمائے امت کا ہم خیال ہونا لیتے ہیں۔ براہ کرم اس حدیث شریف کے مفہوم اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

جواب:۔ "ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ" والی حدیث اور اسی طرح کی دوسری حدیثیں جو اتباع سواد اعظم یا جماعت سے متعلق وارد ہیں مسلم لیگ اور کانگریس کے حامیوں کے درمیان ایک عرصہ سے نہایت بے دردانہ استعمال ہورہی ہیں۔ اور ان میں سے کسی خدا کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ان احادیث کے موقع و محل اور ان کے صحیح مفہوم پر غور کرلے۔ مسلم لیگ کے حامی کہتے ہیں کہ جب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو ضلالت پر اکٹھا نہیں کرے گا، اور مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے لیڈر اور مسلم لیگ کے نظریہ پر متفق ہوگئی ہے تو لازماً یہی راستہ ہدایت کا راستہ ہے اور جو مسلمان اس سے الگ ہیں وہ مفارق جماعت کے حکم میں داخل اور "من شذ شذ فی النار" کی وعید کے مستحق ہیں۔ اور کانگریسی حضرات کا استدلال وہی ہے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں نہ اکثریت کا کسی بات پر متفق ہوجانا اس کے حق ہونے کی دلیل ہے، نہ اکثریت کا نام سواد اعظم ہے، نہ ہر بھیڑ جماعت کے حکم میں داخل ہے، اور نہ کسی مقام کے مولویوں کی کسی جماعت کا کسی رائے کو اختیار کرلینا اجماع ہے۔ ان ساری غلط فہمیوں سے تعرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ مذکورہ بالا حدیث کا مطلب ہم بیان کیے دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث ترمذی میں ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے "ان اللہ لا یجمع امتی او قال امۃ محمد علی ضلالۃ وید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار۔" (اللہ تعالیٰ میری امت کو یا یوں فرمایا کہ محمد کی امت کو، ضلالت پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں پڑا۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ یہ پوری امت گمراہی میں پڑ جائے، بلکہ اس میں ایک گروہ، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور وہی جماعت ہے اور اللہ کا ہاتھ اس جماعت پر ہے اور جو اس جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گرا۔ اس مطلب کی تائید اس حدیث نبوی سے ہوتی ہے جو عبداللہ ابن عمرؓ سے بایں الفاظ مروی ہے:۔

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة - قالوا من هی یا رسول الله؟ قال ما انا علیه واصحابی!

بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب جہنم میں پڑ جائیں گے، بجز ایک کے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کون لوگ ہوں گے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہوں گے۔

احمد اور ابوداؤد کے یہاں پہلی روایت کسی قدر مختلف الفاظ میں ہے اور ان میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہی فرقہ جو آپ کے اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہوگا، جماعت ہے اور اسی کے اوپر اللہ کی رحمت کا ہاتھ ہے۔ عن معاویہ، ثنتان وسبعون فی النار وواحدة فی الجنة، وهی الجماعة (معاویہؓ سے روایت ہے کہ بہتر فرقے جہنم میں ہوں گے، ایک جنت میں ہوگا اور وہی جماعت ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ اس امت پر ایسا آئے گا جبکہ اس کے بڑے حصہ میں ضلالت کا اثر اسی طرح سرایت کر جائے گا جس طرح باؤلے کتے کے کاٹنے سے اس کا زہر آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے صرف تھوڑے لوگ بچے رہیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریق پر ہوں گے، اور وہی لوگ جماعت کے حکم میں ہوں گے۔ بعینہٖ اسی مضمون کی ایک حدیث اور بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

لا تزال طائفة من امتی علی الحق ...... الخ

میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، جو لوگ انہیں چھوڑیں گے، ان کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔

ان احادیث کی روشنی میں زیر بحث حدیث کا مطلب یہ نکلا کہ یہ پوری امت کبھی گمراہ نہ ہوگی، بلکہ ایک جماعت خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہو، حق پر قائم رہے گی اور وہی جماعت ناجی ہے، اسی کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے، بقیہ سب جہنم میں پڑیں گے۔ ان احادیث سے یہ امر بھی بالکل واضح ہے کہ یہ گروہ نہ کثرت میں ہوگا، نہ اپنی کثرت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرائے گا، بلکہ اس امت کے ۷۳ فرقوں میں سے ایک ہوگا اور اس معمورۂ دنیا میں ان کی حیثیت اجنبی اور بیگانہ لوگوں کی ہوگی، جیسا کہ فرمایا ہے "بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدء، فطوبی للغرباء الذین یصلحون ما افسد الناس بعدی من سنتی" (اسلام غربت میں شروع ہوا اور اسی غربت میں پھر مبتلا ہوگا، پس مبارکباد ہے ان "اجنبیوں" کے لیے جو دوسروں کے بگاڑے ہوئے دین کی اصلاح کریں گے)

پس جو جماعت محض اپنی کثرتِ تعداد کی بنا پر اپنے آپ کو وہ جماعت قرار دے رہی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جس سے علیحدہ ہونا جہنم میں داخل ہونے کے مرادف ہے، اس کے لیے تو اس حدیث میں امید کی کوئی کرن نہیں، کیونکہ اس حدیث میں اس جماعت کی دو علامتیں نمایاں طریقہ پر بیان کر دی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہوگی، دوسری یہ کہ نہایت اقلیت میں ہوگی۔

رہے کانگریسی حضرات، تو ان کا استدلال بھی بالکل مہمل ہے۔ اول تو اس حدیث کا تعلق اجماع سے بالکل ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مقام کے چند عالموں کا کسی راہ کو اختیار کر لینا وہ اجماع نہیں ہے جو شریعت میں معتبر ہے۔ شریعت میں معتبر اجماع وہ ہے جس پر مسلمانوں کا امیر اور اس کے ارباب حل وعقد مجتمع

ہو جائیں۔ یہی اجماع سند ہے، یہی کتاب و سنت سے ثابت ہے، یہی طریقہ سلف صالحین سے معلوم ہے اور یہی موافق عقل ہے۔ رہی مولویوں کی کثرت، وہ اولاً تو کانگریس کی تائید میں ہے نہیں، اور اگر ہو بھی تو مولویوں کی کوئی مقدار بھی کسی بات کو شرعی اجماع کی حیثیت نہیں دے سکتی جب تک اجماع کے شرائط موجود نہ ہوں۔

ہاں زیر بحث حدیث سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے کہ اس امت میں ایک گروہ کو (خواہ وہ کتنی ہی قلت میں ہو) حق پر قائم رکھنا مصلحت دینی کے لیے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم فرما دی ہے اس وجہ سے دو باتیں ضروری ہوئیں، ایک یہ کہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی تغییر و تبدیل سے محفوظ کر دیا جائے، دوسری یہ کہ خلائق پر دین کی حجت تمام کرنے کے لیے اس امت کے اندر ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس جماعت کی علامت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہو اور اپنے ہر قول و عمل کو اس کسوٹی پر جانچنے کے لیے تیار رہے۔

ارتداد اور تبلیغ کفر کو روکنے میں جبر کا استعمال

سوال: اسلام میں قتل مرتد کا حکم کس آیت قرآنی سے استنباط کیا گیا ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے ایک ہندو کے سوال کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ "ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے"۔ اس جواب سے دین اسلام کے منوانے میں جبر کا جواز نکلتا ہے، یہ چیز غیر مسلم اقوام کے لیے اسلام پر حملہ کرنے کے لیے ایک محفوظ مورچہ بن گئی ہے۔ آخر ایسا جبری ایمان کس کام کا؟ نیز مسلمان ریاست کے حکام کے پاس وہ کونسی روشن دلیل ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ مرتد کو قتل کریں گے؟

بخلاف اس کے انگریزی راج میں ہر مذہب کے پیرووں کو تبلیغ کی آزادی ہے اور ایک قادیانی تک ۱۹۰۸ء اور ۱۹۳۰ء کے سرکاری اعلان کے ماتحت عین لندن میں اپنے "مسیح موعود" یا بروزی نبی کی دعوت پھیلا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان دین اسلام کی تبلیغ انگریزی شاہی خاندان تک میں کر سکتا ہے اور ان دونوں کی جان کی حفاظت پھر بھی گورنمنٹ پر واجب ہوگی۔ کیا اسلامی ریاست میں بھی ایک قادیانی اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکے گا اور اس کی جان کی حفاظت اسلامی حکومت کرے گی؟

جواب: قتل مرتد کے حکم پر لوگوں کو جو اعتراض ہے وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس اختلاف کا جو ہم میں اور دوسروں میں نفس دین کے بارے میں ہے۔ ہمارے ہاں دین زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ عبادت، ریاست، معیشت، کوئی چیز دین سے باہر نہیں ہے اور دوسروں کے یہاں دین محض پرائیویٹ زندگی تک محدود ہے جو چند رسموں اور چند "عبادتوں" پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے دوسروں کو اس بات میں کوئی زحمت نہیں ہے کہ جب چاہے کوئی شخص ان کے دین سے باہر نکل جائے بشرطیکہ ان کے قانون سیاسی و اجتماعی (یعنی ریاستی دین) کا وفادار رہے۔ اسی طرح اس میں بھی ان کے لیے کوئی زحمت نہیں ہے کہ باہر سے اگر جو شخص چاہے ان کے ہاں اپنے دین کی اشاعت کرے، بشرطیکہ اس کا دین بھی ان کے دین کی طرح پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو۔ وہاں تو اجتماعی زندگی ریاستی قانون (یعنی دین ریاست) کے ماتحت ہے جس نے تدریجاً دین خدا پرستی کو شکست دے کر اور اسے انفرادی زندگی کے دائرے میں محدود کر کے اس کی جگہ لے لی ہے اور اسی

وجہ سے اب سارا زور اس کی وفاداری پر صرف کیا جاتا ہے اور اسے گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی شخص اس ریاستی دین یعنی نظام قانون کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے یا اس کے خلاف بغاوت برپا کرنے اور کسی دوسرے نظام کے قائم کرنے کے لیے تبلیغ کرے۔

ہمارے ہاں شخصی دین اور ریاستی دین الگ الگ نہیں ہے۔ ایک ہی دین ہے جس کا اتباع انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں مطلوب ہے۔ پس ہمارے ہاں اگر کوئی شخص دین سے نکلنے کا اعلان کرتا ہے تو وہ صرف اپنی شخصی زندگی ہی نہیں بدلتا بلکہ ہمارے ریاستی نظام سے بغاوت کرتا ہے اور ملک میں فساد برپا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص باہر سے آکر اپنے دین کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارے اندر آکر ہمارے نظام اجتماعی کے خلاف ہمارے لوگوں کو بغاوت کی دعوت دیتا ہے۔ ان چیزوں کو دنیا کی کوئی ریاست گوارا نہیں کر سکتی۔ انگریز جن کی رواداری کا آپ نے حوالہ دیا ہے، کیا اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ ان کے ملک میں جاکر آپ ان کے نظام کو الٹنے کی دعوت دینے کے کھڑے ہوں؟ بے شبہ انھیں اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ایک قادیانی مشن ان کے ملک میں جاکر اپنے غیر سیاسی دین کی دعوت دے، لیکن کیا وہ ایک مسلم مشن کو بھی گوارا کر سکتے ہیں جو وہاں جاکر یہ دعوت دے کہ بادشاہ حقیقی صرف خدا ہے اور اسی کا قانون ماننا چاہیے اور اس کے قانون کے سوا سارے قانون باطل ہیں اور جو لوگ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی برضا و رغبت اطاعت کرتے ہیں وہ مشرک ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی رواداری کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

جبراً مسلمان بنانے کا بھی یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں اتمام حجت اور وضاحت حق کے بعد کسی شخص کو ضلالت پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ جن قوموں میں خدا نے کسی نبی کو بھیجا اور نبی نے پورے طور پر ان پر حق واضح کر دیا، ان کے منکرین کو خدا نے ہلاک کر دیا، صرف مومنین کو باقی رکھا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری کریں اور جن لوگوں نے نبی کے دین کو قبول نہیں کیا ہے انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کریں، تاکہ اگر ان میں کچھ صلاحیت ہو تو وہ ان کے ماتحت رہ کر دین حق کو قبول کریں، ورنہ کم از کم خدا کی زمین ان کے فساد سے مامون رہے۔ یہ الاؤنس کہ ان کو جینے کا موقع مل گیا، اس وجہ سے دیا جاتا ہے کہ نبی کی بعثت ان کی طرف براہ راست نہیں ہوئی، بلکہ بالواسطہ ہوئی ہے، جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غیر بنی اسمٰعیل تھے جن کو ذمی بنا لیا گیا۔ باقی رہے وہ لوگ جن کی طرف نبی کی بعثت براہ راست ہوتی ہے، چونکہ ان پر اتمام حجت ممکن حد تک ہو چکتا ہے اس وجہ سے ان کے لیے صرف دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں، یا تو اسلام لائیں یا تلوار قبول کریں۔ چنانچہ بنی اسمٰعیل کے منکرین کے ساتھ یہی ہوا۔

اس اصول کے ماتحت اب ان لوگوں کے مسئلہ پر غور کیجیے جو مسلمانوں کے اندر سے خدا کے قانون سے بغاوت کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں میں داخل نہیں ہو سکتے جن کی طرف نبی کی بعثت براہ راست نہیں ہوئی ہے کہ ذمیوں میں شمار ہو سکیں لازماً ان لوگوں میں شمار ہوں گے جن پر حق واضح ہو چکا ہے یا جن کے لیے وضاحت حق کے تمام وسائل موجود ہیں، کیونکہ وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے اندر رہ چکے ہیں۔ اب اگر وہ خدا کے قانون سے بغاوت کرتے ہیں تو آخر خدا کا قانون ان کو کس غرض کے لیے جینے کی مہلت دے گا؟ اب ان کی ہدایت کے لیے کس چیز کا انتظار باقی ہے؟ ان لوگوں کو سورہ مائدہ کی آیت

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ" کی رو سے امام قتل کر دینے کا مجاز ہے۔

نظامِ حق کے نفاذ میں تلوار کا حصّہ

سوال:- میں نے آپ کی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" پڑھی۔ اس میں آپ نے لکھا ہے کہ "تلوار کے زور سے پرانے ظالمانہ نظام زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے"۔ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ قرآن کریم میں جس جہاد پر زور دیا گیا ہے وہ تو یہ ہے کہ "فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا" (فرقان) یعنی کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعے کفار کے ساتھ بہت بڑا جہاد کر۔

ورنہ کیا نعوذ باللہ قرآن مجید میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہے کہ لوگوں کے دل تلوار چلائے بغیر فتح نہ کیے جا سکیں؟ اسلام تو مذہب کے متعلق آزادی دیتا ہے کہ "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (بقرہ) یعنی دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو جبر سے نہیں پھیلایا اور تلوار صرف مدافعت کے لیے اٹھائی نہ کہ تبلیغ کے لیے، کیونکہ کفار کی طرف سے جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ دینی جنگ کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں ہے جو دین کے نام سے مسلمانوں سے جنگ کریں، مگر اس میں بھی زیادتی کی اجازت نہیں۔ "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ"۔ (اور دین کی لڑائی ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر یہ خیال رکھو کہ زیادتی نہ کر بیٹھو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی رائے میں اس وقت ہندوستان کا نظامِ زندگی ظالمانہ ہے؟ اور جن شرائط کے ماتحت اسلام نے جہاد بالسیف کو فرض قرار دیا ہے، وہ ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں؟

جواب:- آپ کا خط غلطیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے قرآن شریف پر بحیثیت مجموعی نہیں غور کیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جتنی آیتیں بھی آپ نے پیش کی ہیں ان میں سے کسی کا بھی صحیح محل آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ آیت "فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا" کا تعلق ان کفار سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حسی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ ان کافروں کی بات پر دھیان نہ کرو اور ان کے ساتھ اس قرآن کے ذریعہ جہاد کرو، اگر ان کا کفر ٹوٹنا ہے تو اسی قرآن سے ٹوٹے گا، ورنہ معجزات سے ان کو کوئی نفع نہ پہنچے گا۔ ہاں تم اپنی طرف سے اس قرآن کی تبلیغ و تفہیم میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

جہاد کے واجب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں لاکھ جوہر سہی لیکن وہاں یہ جوہر کیا کام دے سکتا ہے جہاں سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر ہوں۔ جن قلوب میں کچھ صلاحیت ہوتی ہے قرآن ان کو توجیہ، تبلیغ

رکھی۔ جب تک آپ کے ساتھ کوئی جمعیت نہیں تھی، آپ اور آپ کے تھوڑے سے صحابہ کفار کے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم جھیلتے رہے مگر جب آپ کے ساتھ کچھ جمعیت ہو گئی، آپ نے کفار کے حملوں کو روکا اور تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ اس بیچ میں اگر آپ کو ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے کفار سے صلح کے معاہدے بھی کیے اور اگر ضرورت ہوئی تو جنگ بھی کی۔ آخر کار قرآن کی سورہ برائۃ میں یہ فرمان نازل ہو گیا کہ کفار کی جن جماعتوں نے اپنے معاہدے توڑے ہیں ان کے معاہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جائے اور اشہر حرم کے ختم ہونے پر وہ جہاں پائے جائیں قتل کیے جائیں، اور جب تک وہ توبہ نہ کریں، نماز نہ قائم کریں، زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کو امان نہ دی جائے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۵۔ توبہ)

پھر جب گذر چکیں پناہ کے مہینے تو قتل کرڈالو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور گھیرو اور ان کی تاک میں بیٹھو ہر کمین گاہ میں پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ

اور جن جماعتوں نے معاہدے نہیں توڑے ہیں ان کے معاہدے ان کی مدت کے بعد ختم کر دیے جائیں اور ان سے جنگ کی جائے:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ (۴۔ توبہ)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کر رکھا تھا، پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ مدد کی تمھارے مقابلہ میں کسی کی تو ان سے پورے کرو ان کے عہد ان کی مدت تک۔

اسی طرح مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کے متعلق بھی آخری اعلان یہ کر دیا گیا کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے کہ وہ جزیہ دینے کی ذلت پر راضی ہوں:۔

وَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ ..... مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

لڑو ان لوگوں سے ..... وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر۔

ان صریح اعلانات کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے صرف مدافعت کے طور پر تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بلاشبہ صورت حالات یہی ہے کہ ہر جنگ کے اسباب کفار ہی نے مہیا کیے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل مکہ اگر نزول برائۃ کے بعد بھی کوئی معاہدہ کرنا چاہتے تو ان سے معاہدہ ہو سکتا یا اہل کتاب اگر فتنے نہ اٹھاتے تو ان سے جنگ اور جزیہ کی نوبت نہ آتی۔ کفر اور کافرانہ نظام زندگی کا وجود خود ایک مستقل سبب جہاد ہے اور جب تک یہ دنیا میں باقی ہیں اس وقت تک اگر شرائط و حالات بہم ہوں تو مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ چین کی نیند سوئیں۔ چنانچہ حضرات خلفائے راشدین نے، جنھوں نے قرآن اور پیغمبر کی تعلیم کو سب سے بہتر سمجھا تھا، اسی پر عمل کیا اور اپنے اپنے زمانوں میں برابر جہاد بالسیف کر دنیا میں عدل و قسط قائم کرنے کے لیے جاری رکھا، البتہ

مشرکین مکہ کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے جو اہل کتاب میں یا اہل کتاب کے حکم میں داخل تھیں اسلام اور تلوار کے سوا ایک تیسری راہ جزیہ کی ادائیگی کے ساتھ اطاعت کی بھی کھلی رکھی گئی تھی۔ اس لیے صحابہ نے ان قوموں سے جزیہ لے کر ان کو مطیع بنالیا تاکہ نبی کی بعثت ان کی طرف براہ راست نہ ہونے کی وجہ سے انھیں جو الاؤنس ملنا چاہیے وہ بھی مل جائے اور دنیا ان کے فساد سے محفوظ بھی ہو جائے۔ باقی وہ جنگ کرتے یا نہ کرتے۔ خلفائے راشدین از روئے قرآن مامور تھے کہ ان سے جنگ کریں اور ان کے ہاتھوں سے طاقت چھین کر ان کو مغلوب و مطیع کرلیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے صرف مدافعت کے لیے تلوار اٹھائی وہ درحقیقت صحابہ کے غزوات کو ملوکانہ جنگوں کی حیثیت دیتے ہیں، حالانکہ یہ قرآن کے احکام کا صریحی انکار اور حضرات خلفائے راشدین پر سخت ترین طعن ہے۔ یہ تمام غزوات قیام قسط کے لیے تھے جس پر یہ امت مامور ہے۔

بقرہ کی آیت "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ" کا مطلب بھی آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیات ان مسلمانوں کے شبہات کو دور کر رہی ہیں جن پر اشہر حرم اور بلد حرام کا احترام اس قدر غالب تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان مہینوں اور اس مقام میں کفار حملہ بھی کردیں تو ان کا دفاع نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ جو لوگ تم سے اشہر حرم اور بلد حرام میں لڑیں ان سے لڑو اور یہاں تک لڑو کہ "لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ" یعنی فتنہ (Persecution) کلیۃً ختم ہو جائے اور خدا کی زمین پر صرف خدا کا دین جاری ہو۔ "فتنہ ہو جائے" اور اشہر حرم میں جنگ کی اس اجازت کی وجہ یہ بتائی کہ یہ تو درحقیقت اشہر حرم اور بلد حرام کی بے حرمتی کا قصاص ہے۔ انھوں نے تمھیں اس مقدس سرزمین اور ان مقدس مہینوں کے امان سے محروم کیا ہے، اس لیے تمھیں پورا حق ہے کہ تم بھی ان کے امان سے ان کو محروم کردو۔ البتہ اگر وہ ان مہینوں اور اس شہر میں تم پر حملہ نہ کریں تو تم اپنی طرف سے ان کی حرمت برباد کرنے کے لیے پہل نہ کرو۔

سوال کے دوسرے جز کے سلسلہ میں یہ سمجھ لیجیے کہ ہندوستان کا نظام زندگی بالکل کافرانہ اور ظالمانہ ہے لیکن وہ شرائط یہاں ابھی پورے نہیں ہیں جن کے ماتحت اسلام نے جہاد بالسیف کی اجازت دی ہے۔ جہاد بالسیف کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ "باختیار" امیر کی قیادت میں ہو۔ کسی دوسرے نظام قاہر و مسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی باختیار امیر کا وجود ناممکن ہے، قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کا اعلان ہجرت کے بعد فرمایا۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ جہاد بالسیف کے لیے اٹھیں وہ خود شائبہ فساد و ظلم سے پاک ہو چکے ہوں کیونکہ جہاد زمین کے فساد کو مٹانے کے لیے ہے اور کسی ایسی جماعت کا جہاد کے لیے اٹھنا بالکل مہمل بات ہے جو خود فساد میں مبتلا ہو۔ اس طرح کی کوئی جماعت اور کوئی باختیار امیر چونکہ ابھی ہندوستان میں موجود نہیں ہے اس وجہ سے یہاں جہاد بالسیف روا نہیں۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کا قضیہ

سوال: "اہم استفتاء" کو دیکھ لینے کے بعد "حقوق الزوجین" کی بعض عبارتیں بہت کھٹک رہی ہیں۔ اسی سلسلہ میں توضیح مدعا کی ضرورت ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ:-

"ہندوستانی مسلمانوں کو اس میں تہذیبی خود اختیاری حاصل ہو جس کے تحت مسلمان اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں۔" (حقوق الزوجین ص۶۳)

یہ مطلوب طاغوتی نظام ہی کی نوازش سے حاصل ہوگا نا؟ اور یہ محاکم اپنے احکام کے اجرا کے لیے طاقت بھی تو طاغوت ہی سے لیں گے۔ پھر کیا اس پر اسلام مطمئن ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:-

"اگر یہ چیز بھی حاصل نہ ہو تو "برسبیل تنزل" اتنا ہی سہی، اور یہ بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہو کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے۔" (ایضاً ص۶۳ و ص۶۴)

یہ پنچایت کمیٹی جو نظام باطل کے اذن و اجازت سے اور باطل کے زیر سایہ قائم ہوگی، کیا حق تعالیٰ کو بھی منظور ہوگی؟ دراصل یہ لفظ "تنزل" اپنے مفہوم سمیت ایک جاہلی اصطلاح ہے۔ تنزل ہی کرتے کرتے مسلمان کفر کی سرحد میں داخل ہو کر بھی کٹر مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ پھر آگے یہ الفاظ نظر آتے ہیں:-

"حکومت متسلط پر دباؤ ڈال کر اس سے پنچایتی نظام کو تسلیم کرا لیا جائے۔" (ایضاً ص۶۴)

اللہ اکبر! سارے عالم سے طاغوت کو بے دخل کرنے والا "المسلم" نظام پنچایتی پر قانع ہو جائے اور نمک برحراست یہ کہ اس نظام کا قیام بھی طاغوت کی منظوری کا محتاج ہو! "حکومت متسلط پر دباؤ" بھی کیا وہ مسلمان ڈالیں گے جو اس طاغوتی نظام پہ بالکل راضی ہیں اور اسلام کا جوا اتارنے کی فکر میں ہیں۔ پھر دباؤ ڈالنے کا ہی عزم ہے تو آدھے پونے اسلام کی منظوری تک کیوں محدود ہے؟ کیوں نہیں کامل اسلام کے کامل غلبہ کی کوشش کا مشورہ دیا گیا؟

ایسے ہی اور بہت سے مقامات نظر سے گذرے ہیں جو اہم استفتا کے مباحث کی مد ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- آپ نے جن جذبات دینی کے ماتحت گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے اور نظام باطل سے ہر قسم کے تعلق سے جس طرح برات کا اظہار کیا ہے اس سے دلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے دل میں یہی جذبات پیدا کرے۔ حقوق الزوجین میں اس قسم کی تجویزیں جو برسبیل تنزل لکھی گئی ہیں جماعت اسلامی کے مسلک کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ان جماعتوں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہیں جو موجودہ نظام کے تحت اپنی مذہبی مشکلات کے حل کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ اس بات کی تصریح بھی نہایت واضح الفاظ میں کر دی گئی ہے، تعجب ہے کہ اس کے باوجود آپ کو یہ شبہات کیوں لاحق ہوئے۔ بعد میں ایک رفیق کے سوال کے جواب میں ترجمان القرآن کے صفحات میں بھی اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ بہرحال جماعت اسلامی کا طرز عمل بالکل غیر مشتبہ ہے اور اس طرح کے شکوک کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

فقہا و ائمہ سے انتساب مسلک

سوال:- "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی آپ نے جو تشریح فرمائی ہے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی فقیہ یا مجتہد سے اخذ کردہ مسائل اسلام پر اس فہم کے ساتھ عمل کر رہا ہو کہ وہ مسائل اس فقیہ کی رائے

اور اس کا مذہب ہیں تو اس کا یہ فہم اور عمل دونوں گمراہی ہیں۔ اسے تو اس فہم و ادراک کے ساتھ عمل کرنا چاہیے کہ یہ مسائل اس فقیہہ یا مجتہد کے خانہ ساز مسائل اور ان کے خود ساختہ مذہب نہیں، بلکہ وہ خاص اسلام کے مسائل ہیں جن کا علم اسے اس فقیہہ یا مجتہد کی وساطت اور ذریعہ سے حاصل ہوا۔ کسی فقیہہ یا مجتہد سے حاصل شدہ مسئلہ اسلام کو یہ حیثیت دے کر عمل کرنا کہ یہ مسئلہ اس فقیہہ یا مجتہد کا مسئلہ اور اس کا مذہب ہے، پہلی بڑی ضلالت ہے اور ضلالۃً فوق ضلالۃ یہ ہے کہ اپنے عمل اور اپنے اس اتباع کو اس فقیہہ و مجتہد کی طرف منسوب بھی کر دیا جائے۔ شارع علیہ السلام کے علاوہ کسی اور کی طرف، کسے باشد انتساب ہی غلط ہے۔ جس مسئلہ پر عمل ہو اس فہم و شعور کے ساتھ ہو کہ یہ مسئلہ اسلام کا مسئلہ ہے اور اس عمل میں ہم اتباع اسلام کر رہے ہیں۔

نیز یہ کہنا کہ میں اس مسئلہ میں فلاں فقیہہ کا پیرو ہوں اور یہ کہ اس بارے میں فلاں مجتہد صاحب کا مذہب میرا اصول ہے اور کسی کا یہ طے کر دینا کہ ایک دو یا چند ایک بزرگان متقدمین کے مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی لازمی ہے، میرے خیال میں بوجوہ مذکورہ درست نہیں۔

میں نے اپنی سمجھ کے مطابق حقوق الزوجین اور رسالہ دینیات میں ایسے مقامات دیکھے ہیں جہاں مسائل کے اخذ اور ان کے بیان میں "مذاہب" کے ذکر اور ان کی طرف انتساب کو نمایاں دخل ہے۔ یعنی "یہ مسئلہ فلاں مذہب کا ہے" اور "فلاں مذہب کا یہ مسئلہ درست نہیں" اور "فلاں مذہب کے مطابق عمل درست ہوگا" وغیرہ نہ ہونا یوں چاہیے کہ "یہ مسئلہ اسلام کا ہے" اور "یہ مسئلہ اسلام کا نہیں، اس لیے درست نہیں" اور "اسلام ہی کے فلاں مسئلہ پر عمل درست ہوگا" وغیرہ!

اگر ان شبہات میں میں حق بجانب نہیں ہوں تو میری غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں۔

جواب: کسی اجتہادی مسئلہ کو عین دین اسلام کہہ کر پیش کرنا یا اس پر عین شریعت اسلام سمجھ کر عمل کرنا غلط ہے۔ جس معاملہ میں نصوص شریعت موجود نہ ہوں اس میں ایک مجتہد اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر بھی وہ پہنچتا ہے یہ اس کی اپنی رائے ہوتی ہے، جس میں خطا اور صواب دونوں کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی رائے کو عین اسلام کہہ کر پیش کرے۔ وہ صرف یہی کہہ کر پیش کر سکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول کی مرضی سے اقرب بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کرام اور ائمہ عظام تمام اجتہادی امور میں اسی طرح اپنی رائیں پیش کیا کرتے تھے، کوئی بھی یہ کہہ کر پیش نہیں کرتا تھا کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے یا رسول کا یہ ارشاد ہے یا شریعت اسلام کا یہ حکم ہے۔

جو لوگ ان اجتہادات کو قبول کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں میں فلاں امام کا پیرو ہوں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں اس امام کے اجتہاد کو اوفق بالکتاب والسنۃ پاتا ہوں اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ قباحت جس چیز میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ آدمی کسی ایک امام یا عالم کا اندھا مقلد بن جائے اور حق و ہدایت کو اس کی پیروی کے اندر محصور کر دے۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ آپ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں، لیکن تعبیر میں بات خلط ملط ہو گئی۔

قرآن و حدیث اور سائنٹفک حقائق

سوال: قرآن و حدیث میں بہت سے امور ایسے بیان ہوئے ہیں جنہیں زمانہ حال کی تحقیق غلط قرار دیتی ہے۔ اس صورت میں

ہم قرآن و حدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو ؟ مثلاً :-

ا - قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی آدمؑ سے پیدا ہوئی، بخلاف اس کے علمائے دورِ حاضر کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔

ب - قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں آفتاب ساکن ہے۔

ج - اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک ہوتی ہے، اس کے متعلق اسلام کی رائے یہ ہے کہ یہ بادلوں کو ہنکاتے ہوئے فرشتوں کے کوڑے پٹکنے اور آواز نکالنے ہیں، حالانکہ زمانۂ حال کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔

د - "کانا دجال" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے تو آخر وہ کونسی جگہ ہے۔ آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتہ نہیں چلتا ؟

جواب :- مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق و تفتیش کے دوران میں آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹفک طریقہ سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو، البتہ سائنس دانوں یا فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کیے ہیں ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائیدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی پہلی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی ایسی چیز سے جو تجربہ و مشاہدہ سے بیرہن ہو چکی ہو، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پائے، مگر جیسا کہ اوپر میں لکھ چکا ہوں، ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔ اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کردوں جنھیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے :-

ا - ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اس وقت تک محض نظریہ ہے، ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ علی گڑھ ایک علمی مرکز ہے جہاں اس نظریہ پر ایمان لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کو مل جائے گی، آپ خود ان سے پوچھ لیجیے کہ یہ نظریہ (Theory) ہے یا واقعہ (Fact) ؟ اگر ان میں سے کوئی صاحب اسے واقعہ قرار دیں تو ذرا ان کا اسم گرامی مجھے بھی لکھ دیجیے۔

ب - علی گڑھ میں فلکیات (Astronomy) جاننے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ذرا ان لوگوں سے پوچھیے کہ کیا واقعی آفتاب ساکن ہے ؟ اگر ایسے کوئی صاحب مل سکیں تو ان کے نام سے بھی علمی دنیا کو ضرور مطلع کرنا چاہیے۔ غالباً آپ ابھی تک نیوٹن کی صدی کی سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں جبکہ آفتاب متحرک نہ تھا۔ موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

ج - قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں چمک اور کڑک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (Process) بیان

کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک موجودہ زمانہ کی سائنٹفک تحقیقات کے مطابق ہے اور اتنا جدید (up to date) ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

۷۔ یہ "کانا دجال" وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ عوام میں اس قسم کی جو باتیں مشہور ہوں، ان کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے، اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ میں تحریک اسلامی کا طریق کار

سوال:۔ یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان کے لیے، بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شعور حاصل کر چکا ہو، صرف ایک ہی چیز مقصد زندگی قرار پا سکتی ہے اور وہ ہے حکومت الٰہیہ کا قیام۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وہی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت سے عقلاً مناسبت رکھتا ہو اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عملاً ہمیشہ اختیار کیا ہو۔ حکومت الٰہی کے نصب العین کے داعی انبیاء کرام ہیں، اس لیے طریق کار بھی وہی صحیح ہے جو انبیاء کا طریق کار ہو۔ انبیاء کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت اسٹیٹ ایک موثر اور منظم طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کارفرما نظر آتا ہے اور اکثر حالات میں وہ ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کلی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ دوسرے وہ جن کا واسطہ ایک ایسی سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں اسٹیٹ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ "سرقبیلی" (Patriarchical) قسم کا اسٹیٹ تھا، جیسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے جو غالباً اسی سیاسی اختلاف احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جتنی جامعیت اور ہمہ گیری اسٹیٹ نے اب حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس نے آجکل فرد کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور جس قدر منظم، موثر اور مضبوط طاقت فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس نے اب اختیار کر لی ہے اس کی مثال شاید پچھلی تاریخ میں نہ مل سکے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہی طریق کار جو تقریباً غیر ریاستی (stateless) سوسائٹی یا حد سے حد "سرقبیلی حکومت" (Patriarchical) والی سوسائٹی میں کامیاب طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اب بھی اس قسم کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے؟ کیا آجکل کے بدلے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لیے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فن انقلاب انگیزی (Technique) کافی حد تک نہیں بدلنا پڑے گا؟

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا۔ چنانچہ انھوں نے جب قوت متسلط (sovereign power) کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو فوراً "اجعلنی علیٰ خزائن الارض" کہہ کر اقتدار سنبھال لیا اور اس طرح اپنا مشن پورا

کرنے کے لیے پہلے کے قائم شدہ اسٹیٹ کو استعمال میں لے آئے۔ موجودہ زمانہ کا اسٹیٹ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور منظم ہے۔ اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے جو انقلاب بھی ہوگا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گذرے گا، جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محض توڑ پھوڑ قسم کا انقلاب نہیں چاہتا ہے، بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے۔ ان حالات میں تو زیادہ موزوں طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کلی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کارروائی درست نہیں ہوگی بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائیگی

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سروس کے مناصب نہیں، جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا ہے، بلکہ ایک منظم جماعت کا جد وجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوتِ حاکمہ (sovereign power) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب:۔ بلاشبہہ ایسی حالت میں جبکہ اسٹیٹ ہمہ گیر ہو اُس حالت کی بہ نسبت جبکہ سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے، لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں منظم کرتے جائیں گے، پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجودالوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے، اپنے مقصد سے ہے، نہ کہ کسی خاص طریق کار (Method) سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (Substance of Power) ملنے کی کوئی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام انقلابی دعوت جاری رکھیں گے اور تمام مشروع ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔

موجودہ سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال:۔ اس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اول کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ ہو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روحِ اسلامی سراسر مفقود ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے، اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مرادف ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک، اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس نے یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش ہے اور یہ

انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیرلیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹ پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟

جواب:۔ آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے اس لیے آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آئے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں، حالانکہ اگر آپ ذرا وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چرائے۔ اس سزا سے اگر مسلمان کبھی بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اس اصلی و بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلط ہوئے ہیں اور اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انھیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں، یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سدباب نہ ہوگا بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے قائم کر دے گی۔

آپ نے جو سوال ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اول یہ کہ ہماری جماعت کے مقصدِ قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے، اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول بھی چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں، جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنا پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور کے اصول پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔ اگر ہندوستان کے علماء اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلے میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

مطبوعات ذیل چھپکر مکتبہ میں پہنچ چکی ہیں

دینیات۔ قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] — تفہیمات [illegible]

خطبات [illegible] — مسئلہ جبر و قدر [illegible]

زیر طبع مطبوعات

مسئلہ قومیت — تنقیحات — سیاسی کشمکش حصہ سوم — مذہب کا انقلابی تصور

ہیگل، مارکس اور نظام اسلام۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر۔

دین حق